فقہ اسلامی کے ابتدائی ادوار پر ایک اجمالی نظر

(محمد عبد الرحیم غنیمہ، مراکش)

فقہ صدرِ اوّل میں جب تک رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے، تب تک مسلمانوں کے لیے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کے سلسلے میں آپ ہی کی ذات قدسی صفات مرجع و ماویٰ رہی۔ زندگی کے مختلف معاملات و مواقع پر مسلمانوں کو جو الجھن لاحق ہوتی اور ان میں شریعت کی رائے دریافت کرنا مطلوب ہوتی، تو وہ فوراً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور استفسارات کی صورت میں آپ سے رہنمائی حاصل کرتے، حلّت و حرمت کی حدود سے آگاہی حاصل کرتے اور دین کے احکام و مقاصد کو سیکھتے۔ آپؐ کے وصال کے بعد جب خلفائے راشدین کا دور (۱۱ھ ـ ۴۰ھ) آیا تو نئے نئے مسائل کے بارے میں شرعی حکم لگانے، فتاویٰ جاری کرنے اور کتاب و سنّت کی تعلیم دینے کے اختیارات قدرتی طور پر کبار صحابہ کی طرف منتقل ہو گئے اور بالخصوص اس مسند کے مستحق وہ لوگ قرار پائے جو کتاب اللہ کے حافظ تھے۔ ابنِ خلدون کے الفاظ میں:

> "صحابہ کی پوری جماعت اہلِ فتویٰ نہ تھی، اور نہ ہی شرعی و دینی امور میں سب کو مرجعیت حاصل تھی، بلکہ افتاء و تعلیمِ دین کی سرانجام دہی صرف حفاظ (حاملینِ قرآن) کے لیے مخصوص تھی، اس گروہ نے یا تو براہِ راست چشمۂ رسالت سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور یا اجلّۂ صحابہ سے آیاتِ قرآنی کے منشاؤ اقتضاء کی روشنی حاصل کی تھی، اس لیے یہ گروہ نسبتۃً قرآن کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور جملہ دلالات و اغراض پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس گروہ کو قرّاء (یعنی قرآن پڑھنے والے) کے لقب سے پکارا جاتا تھا کیونکہ عرب ان پڑھ قوم تھی، پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اس لیے پڑھے ہوئے لوگ اپنے خصوصی امتیاز اور نادر الوجود ہونے کی وجہ سے ناخواندہ قوم میں قاری کہلاتے تھے۔ دورِ اوّل تک اس گروہ کے لیے قرّاء کا لقب متداول رہا۔ البتہ جب اسلامی سلطنت کی حدود دُور دُور تک پھیل گئیں کتاب و سنت کے چرچے نے عرب سے ناخواندگی اور جہالت کی تاریکی کافور کر دی، قریہ قریہ اجتہاد و

استنباط کی مجلسوں سے نغمہ ریز ہوگیا، فقہ نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی بلکہ اُسے ایک "فن" کی حیثیت حاصل ہوگئی تو قراء کے بجائے ایسے لوگوں کو علماء اور فقہاء کے نام سے پکارا جانے لگا۔[1]

فتویٰ دینے میں بھی صحابہ کے تین طبقے کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ مکثرین کا ہے جس سے بکثرت فتاویٰ منقول ہیں اور دوسرا مقلین کا ہے، جس سے بہت کم تعداد میں فتاویٰ مروی ہیں اور تیسرا طبقہ متوسطین کا ہے، اس طبقے سے فتاویٰ کثرت سے منقول نہیں ہیں البتہ ایک معتد بہ تعداد اس طبقے سے ہم تک پہنچی ہے۔ مجموعی طور پر اہلِ فتویٰ صحابہ کی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ مکثرین کی کل تعداد سات ہے جن کے نام یہ ہیں:

(۱) عمر بن خطابؓ (۲) علی ابن ابی طالبؓ (۳) عبداللہ بن مسعودؓ (۴) ام المومنین عائشہؓ (۵) زید بن ثابتؓ (۶) عبداللہ بن عباسؓ (۷) عبداللہ بن عمرؓ۔

طبقہ متوسطین میں جن کو شمار کیا جاتا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) ابوبکر الصدیقؓ (۲) ام سلمہؓ (۳) انس بن مالکؓ (۴) ابوسعید الخدریؓ (۵) ابوہریرہؓ (۶) عثمان بن عفانؓ (۷) سعد بن ابی وقاصؓ (۸) سلمان فارسیؓ (۹) جابر بن عبداللہؓ (۱۰) معاذ بن جبلؓ (۱۱) طلحہؓ (۱۲) زبیرؓ (۱۳) عبدالرحمن بن عوفؓ (۱۴) عمران بن حصینؓ (۱۵) ابوبکرہؓ (۱۶) عبادہ بن الصامتؓ (۱۷) معاویہ بن ابی سفیان۔

مذکورہ بالا حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے علاوہ صحابہ کی جتنی تعداد ہے وہ سب طبقہ ثالثہ (مقلین) میں شامل ہے، ان سے بہت کم مسائل میں فتاویٰ ماثور ہیں۔ حتیٰ کہ کسی سے صرف ایک اور کسی سے دو یا دو سے کچھ اوپر فتاویٰ روایت کیے گئے ہیں۔[2]

فقہ دورِ اموی میں سنہ ۴۰ھ سے لے کر سنہ ۱۳۲ھ تک بنی امیہ کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جانشینی تابعین کو حاصل ہو رہی تھی جو امورِ دین اور فقہ میں اپنے شیوخ صحابہ کے رہینِ منت تھے۔ تابعین کے مختلف گروہ مختلف صحابہ کے حلقۂ تلمذ میں داخل تھے۔ ان میں سے ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ کسی ایک صحابی کی فقہی و شرعی آراء کی اتباع

[1] مقدمہ ابن خلدون: ص ۴۲۲
[2] اعلام الموقعین، ابن القیم: ج اول ص ۵۸

کو مخصوص کر لیا مثلاً اہلِ مدینہ کا تمام تر رُخ عبداللہ بن عمر کی طرف تھا، اہلِ کوفہ نے اپنے آپ کو عبداللہ بن مسعود کے فتووں کا پابند کر لیا تھا، عبداللہ بن عباس اہلِ مکہ کے پیشوا تھے، عبداللہ بن عمرو بن العاص اہلِ مصر کے لیے ہر قول و عمل میں مرجع بن گئے تھے[1]۔

اصحابِ رسول کا، جنھوں نے بلا واسطہ شمعِ نبوت سے نورِ دین اور فیضِ بصیرت اخذ کیا تھا، دنیا سے اُٹھ جانا ملتِ اسلامی کے لیے ایک بہت بڑا نقصان اور علم و فقہ کی دنیا میں ناقابلِ تلافی خسارہ تھا، مگر حکمتِ خداوندی نے اپنے دین کو تا قیامِ قیامت زندہ و برقرار رکھنے کے لیے اس کا ایسا عمدہ انتظام فرمایا کہ صحابہ کا گروہ جوں جوں علمی و فقہی مسانَد کو خالی کرتا گیا، تابعین میں سے نوابغ فقہاء و علماء ان مسانَد پر فروکش ہوتے گئے اور صحابہ کے پیدا کردہ خلاء کو بطریقِ احسن پُر کرتے گئے۔ جلیل القدر تابعین کی فہرست میں جو لوگ داخل ہیں، ان میں سے ایک ابو محمد سعید بن مسیب (وفات ۹۱ اور ۹۴ھ کے درمیان ہوئی ہے) ہیں، جو اہلِ مدینہ کے لیے مشعلِ راہ قرار پائے اور دوسرے ابو محمد عطاء بن ابی رباح ہیں، جو اہلِ مکہ کے مفتی تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تابعین، تبع تابعین اور بعد کے فقہاء کی اکثریت اہلِ عجم اور موالی پر مشتمل تھی خالص عرب ان میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ ابنِ قیم عبدالرحمٰن بن ابی زید سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:-

> "عبادلہ ثلاثہ (عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص) کی رحلت کے بعد تمام شہروں میں فقہ و اجتہاد کی مسانَد پر موالی اور اعاجم فروکش ہو گئے، چنانچہ مکہ کی درسگاہِ فقہ پر عطاء بن ابی رباح فائز ہو گئے، اہلِ یمن کے لیے طاؤس امامِ فقہ قرار پا گئے۔ یمامہ والوں نے یحییٰ بن ابی کثیر کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیا، کوفہ میں ابراہیم نخعیؒ اور بصرہ میں حسن بصری عوام کے مرجع و امام بن گئے، اسی طرح شام میں مکحول اور خراسان میں عطاء خراسانی پیشوائے دین اور ترجمانِ شرع تسلیم کیے گئے، صرف ہادیٔ اعظم کا شہر ـــ مدینہ ـــ ایک ایسا مقام تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قریشی عرب کے مخصوص کر لیا۔ اور وہ تھے حضرت سعید بن مسیب جو بلا اختلاف مدینہ والوں کے لیے امام الفقہ تھے"[2]۔

---

[1] نظرۃ تاریخیۃ فی حدوث المذاہب الاربعۃ، از احمد تیمور پاشا مصری ص ۶ [2] اعلام الموقعین جلد اول ص ۸۔

ان جلیل القدر فقہاء کا وجود دراصل ائمۂ مذاہب کے ظہور کا پیش خیمہ ثابت ہوا کیونکہ ان فقہائے تابعین نے استنباط واستخراج کی جو طرح ڈالی اور مختلف حلقہ ہائے فقہ قائم کیے۔ آگے چل کر ائمۂ مذاہب نے اسی چیز کو مزید ارتقاء بخشا اور فقہ واجتہاد کی مختلف امامتیں روبکار آگئیں۔ ہر علاقے میں ایک امام پیدا ہوگیا۔ ان تمام ائمہ مذاہب میں سے اکثریت عہد بنی امیہ کے اواخر اور عہد عباسیہ کے اوائل تک بزم فقاہت وبصیرت کی چشم وچراغ رہی۔ دولت عباسیہ کا قیام اتفاق سے ایسے زمانے میں ہوا جب کہ علمی وفقہی تحریک شباب پر آگئی اور فنون وآداب کو اقتدار حاصل ہوگیا چنانچہ دور بنی امیہ کی نسبت اس دور میں فقہاء کے اثرات زیادہ گہرے اور نتیجہ خیز ہیں۔

فقہ عصر عباسی میں: عصر عباسی نے جن فقہی مذاہب کا عروج دیکھا ہے وہ یہ ہیں:

عراق میں امام ابوحنیفہ اور امام ثوری رحمہما اللہ کا مذہب جاری ہوگیا، شام اور اندلس کی سرزمین پر امام اوزاعی کے مسلک کی حکمرانی رہی، مدینہ امام مالک کی فقہ کے زیر نگیں تھا، مصر میں لیث بن سعد اور امام شافعی کے مسلک کا غلغلہ تھا، بعد میں محمد بن جریر طبری، داؤد ظاہری اور احمد بن حنبل کے مسالک کا بھی وہاں چرچا رہا۔ ان تمام مذہبی سرگرمیوں میں ثوری، اوزاعی، لیث، طبری اور داؤد ظاہری کے مذاہب زیادہ دیر تک نہ پنپ سکے۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد دنیا سے ناپید ہوگئے، اور مذاہب اربعہ: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی پر زمانے نے نقش دوام ثبت کر دیا۔

ناپید شدہ مذاہب ان مذاہب اربعہ کے ظہور ووسعت پذیری پر گفتگو کرنے سے قبل ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصر طور پر ناپید شدہ مذاہب پر بھی روشنی ڈالیں۔

مذہب ثوری مذہب ثوری کے بانی ابوعبداللہ سفیان ثوری ہیں، کوفہ میں رہتے تھے۔ اجتہاد واستنباط میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ امام مالک اور امام اوزاعی ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر چکے ہیں۔ اپنے دادا ثور بن عبد منات کی نسبت سے ثوری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سرکاری مناصب اور عہدوں سے اپنے دامن کو تادم آخر ملوث نہیں ہونے دیا۔ ان کے

بارے میں آتا ہے کہ ایک بار عباسی خلیفہ مہدی نے انہیں کوفہ کی قضا (جج یا مجسٹریٹی) سنبھال لینے کا فرمان جاری کیا۔ امام ثوری اس فرمان کو وصول کرتے ہی دریائے دجلہ کی جانب روانہ ہو گئے اور دریا کے کنارے پہنچ کر اسے غرق آب کر دیا۔ اس ایک مثال سے ان کی شانِ استغناء اور جرأت و حوصلہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی[1]۔

مذہب اوزاعی اس مذہب کے علمبردار امام اوزاعی کا پورا نام ابو عمرو عبدالرحمن بن عمرو بن محمد ہے۔ دمشق کے باب فرادیس کے بیرون میں اوزاع نامی ایک بستی ہے۔ آپ وہیں کے رہنے والے ہیں[2] اور اسی نسبت سے اوزاعی کہلاتے ہیں۔ حق پر ثابت قدمی اور صبر و تحمل میں ضرب المثل رہے ہیں۔ روزمرہ کے مسائل و احکام میں غیر معمولی درک و اہتمام تھا۔ یہاں تک کہ امام مالک رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: انہ یصلح للامامۃ (یہ پیشوائی کے مستحق ہیں)۔ امام اوزاعی ملکی سیاسیات میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ حکمرانوں اور خلفاء اور گورنروں پر متواتر نکتہ چینی کرتے رہتے اور انہیں راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے رہتے۔ اگر پبلک مفادات کے خلاف یا عدل و انصاف کے منافی ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے تو نہایت سختی سے ان کا نوٹس لیتے۔ ان کی ایسی حرکتوں کو عوام الناس کے علم میں لاتے[3]۔ امام رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۷ھ میں ہوئی اور صحیح روایت کے مطابق بیروت میں ان کا مدفن ہے[4]۔ آغاز کار میں تو ان کا مذہب شام میں پھیلا، مگر بعد میں جب اندلس کا علاقہ اسلامی فتوحات میں شامل ہوا، تو اہلِ شام ہی کے ہاتھوں وہاں بھی اوزاعی مذہب کا کافی شہرہ ہو گیا۔ اور کچھ مدت تک اسی کا دور دورہ رہا مگر جب تیسرا اموی حکمران، حکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل سریر آرائے سلطنت ہوا، تو امام اوزاعی کا مذہب ختم ہو گیا اور اس کے بجائے امام مالکؒ کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا[5]۔

مذہب لیث بن سعد مالکی اور شافعی مذاہب کے داخلے سے پہلے اہلِ مصر کی مسندِ امامت پر امام لیث بن سعد بن عبدالرحمن سرفراز تھے۔ ان کے آباء و اجداد اصفہان (فارس) کے رہنے والے تھے۔ یہ خود

---

[1] محاسن المساعی ص۵۶   [2] ایضاً ص۶۶ و ۷۴   [3] ایضاً ص۱۰، ۱۱

[4] ؍؍ ص ۱۲۴، ۱۶۰   [5] ؍؍ ص۱۱

مصر کے ایک گاؤں قلقشندہ میں پیدا ہوئے تھے۔ امام سیوطی کے قول کے مطابق ان کی ولادت سنہ ۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ امام شافعیؒ نے لیث بن سعد کے متعلق لکھا ہے کہ لیث کا درجہ فقاہت میں امام مالکؒ سے بھی بلند ہے، مگر لیث کے متبعین نے ان کے مذہب کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ یعنی انہوں نے اس کی تدوین و ترویج پر کوئی اعتنا نہیں برتا۔ اُسے بے سہارا چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا سے یکسر ملیامیٹ ہو گیا۔[۱]

مذہب ظاہری مذہب ظاہری کے پیشوا ابو سلیمان داؤد بن علی بن خلف اصفہانی ہیں۔ کوفہ میں سنہ ۲۰۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ پہلے یہ منتسب شافعی تھے مگر بعد میں انہوں نے اپنے لیے ایک مخصوص مسلک پیدا کر لیا۔ اس مسلک کی بنیاد یہ تھی کہ کتاب و سنت کے ظاہر پر عمل کیا جائے، جب تک خود کتاب و سنت سے یا اجماع سے کوئی ایسی دلیل مہیا نہ ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ یہاں ظاہری حکم مراد نہیں ہے، تب تک ظاہری حکم پر عمل کو ترک نہ کیا جائے۔ جہاں عملی نص نہ ملے وہاں اجماع کو اختیار کیا جائے قیاس و استنباط کو ظاہری مسلک کے بانی نے سرے سے رد کر دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کی عمومات میں ہر مسئلہ کا جواب موجود ہے۔ داؤد الظاہری نے اپنے اس مذہب کو برحق ثابت کرنے کے لیے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں ابطال التقلید، ابطال القیاس، الخصوص والعموم، المفسر والمجمل زیادہ مشہور ہیں ان کے علاوہ بھی بہت ساری کتابیں ہیں۔[۲]

ظاہری مذہب کو سلطنتِ عباسیہ کے مشرقی علاقوں میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص فارس کے علاقہ میں اس کے ماننے والوں کی کثیر تعداد رہتی تھی، اور وہاں مذہبِ شافعی سے اس کا خاصہ مقابلہ ٹھنا رہتا تھا۔ اور اسے ہر مقام پر غلبہ حاصل رہتا تھا۔[۳] امام داؤد بانیٔ مسلک کا انتقال سنہ ۲۷۰ھ میں بغداد میں ہوا۔ اس مذہب کے جلیل القدر پیروؤں میں سے ایک ابنِ حزم اندلسی بھی ہیں۔ جو اپنے غیر معمولی علم و فضل کی وجہ سے مذہبِ ظاہری کو رونق و ترقی دینے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ عہدِ مجتہدین

---

[۱] ابن خلکان جلد اوّل ص ۴۲۸ [۲] تاریخ التشریع الاسلامی للخضری ص ۲۷

[۳] الشافعی از ابو زہرہ مصری، ص ۲۷۔

میں مغرب (شمالی افریقہ) میں فرقہ الحزمیہ کے نام سے ان کے متبعین کی جماعت کافی نامور رہی ہے ابن حزم کی فقہ ظاہری پر کتاب "المحلّٰی" فقہی لٹریچر میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔

مذہب طبری | محمد بن جریر طبری نہ صرف فقہ میں ایک مستقل مذہب کے مالک ہیں، بلکہ تاریخ و تفسیر کے میدان میں بھی ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، تاریخ طبری اور تفسیر ابن جریر انہی کے رشحات علم و فکر کی یادگاریں ہیں۔ امام داؤد الظاہری کی طرح پہلے یہ بھی شافعی المسلک تھے۔ پھر انہوں نے ایک مستقل بالذات مسلک اختیار کر لیا۔ اور اس پر متعدد تصانیف بھی لکھیں جن میں "لطیف القول"، "الخفیف" اور "البسیط" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح فقہ کے موضوع پر ان کی ایک نہایت اہم کتاب "اختلاف الفقہاء" ہے۔ اس کتاب میں امام موصوف نے اپنے ہمعصر فقہاء کے آراء و اقوال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک ابو الحسن احمد بن یحییٰ ہیں۔ انہوں نے اپنے امام کی حمایت میں دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ایک "المدخل الی مذہب الطبری و نصرۃ مذہبہ" اور دوسری "الرد علی المخالفین" ہے[1] ابن جریر الطبری کی ولادت طبرستان میں آمل نامی مقام پر ۲۲۴ھ میں ہوئی اور ۳۱۰ھ میں انہوں نے بغداد میں انتقال فرمایا[2]۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم وادخلھم فی جنات النعیم۔

اب ہم اجمالی طور پر مذاہب اربعہ کے ظہور اور ان کے فروغ کے وجوہ و اسباب کا جائزہ لیتے ہیں

مذہب حنفی | مذاہب اربعہ میں سے سب سے پہلے مذہب حنفی کا نام آتا ہے، اس کے مؤسس امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد افغانستان کے رہنے والے تھے۔ آپ کی پیدائش ۸۰ھ میں کوفہ میں ہوئی۔ اور بروایت صحیح آپ کی وفات بغداد میں ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ امام اعظم کے متبعین فقہی حلقوں میں اہل الرائے کے لقب سے موسوم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عراق میں حدیث کا پھیلاؤ بہت کم ہوا ہے۔ اسی لیے عراق والوں نے مسائل شرعیہ میں قیاس و اجتہاد سے کثرت سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اس میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ امام اعظم کا فقہی مسلک معلوم کرنے کے ان کے یہ الفاظ جنہیں خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے، کافی ہیں:

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی للخضری ص ۲۸۴ [2] ابن خلکان ج اول ص ۵۰۸

"میں سب سے پہلے اللہ کی کتاب کو اپنے عمل کی بنیاد بناتا ہوں، اگر وہاں سے کوئی رہنمائی نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اگر یہ دونوں مآخذ دین خاموش ہوں تو پھر میں اصحابِ رسول کے اقوال کو اختیار کرتا ہوں۔ ان کے متعدد اقوال میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں ترک کر دیتا ہوں۔ بہر حال میں انہی کے اقوال کے اندر رہتا ہوں ان کے ہوتے ہوئے غیر کے قول کی جانب رخ نہیں کرتا۔ اور اگر معاملہ صحابہ سے چل کر ابراہیم، شعبی ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید بن مسیب وغیرہم تک پہنچ جاتا ہے تو ان کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ لوگ مجتہد تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد و قیاس سے کام لینے کا حق رکھتا ہوں[1]۔"

مذہب حنفی کو اصل شہرت و وسعت ہارون رشید کے زمانے (سنہ۱۷۰ھ) میں ہوئی ہے۔ ہارون رشید نے مذہب حنفی کے علمبردار اور امام اعظم کے شاگرد رشید ابو یوسف کو عباسی قلمرو میں چیف جسٹس کے عہدے پر متعین کر دیا۔ اور اس کے بعد عراق، خراسان، شام، مصر اور افریقہ کے آخری کناروں تک جہاں کہیں بھی قضاۃ کے تعین کا معاملہ در پیش آیا۔ ہارون رشید نے ابو یوسف رحمہ اللہ کے مشورے پر عملدرآمد کیا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے تمام علاقوں میں مذہبِ حنفی کے متبعین اور منتسبین کو مناصبِ قضاء و ولایت پر نامزد کر دیا۔ چنانچہ اُسی روز سے اس مذہب کو سلطنتِ عباسیہ میں سرکاری مذہب (المذہب الرسمی) کی حیثیت حاصل ہو گئی[2]۔

شروع میں افریقہ اور مغرب کے ممالک میں کسی مخصوص فقہی مذہب کا تفوق قائم نہیں تھا بلکہ وہاں زیادہ تر احادیث و آثار پر عمل جاری تھا۔ جب عبداللہ بن فروخ ابو محمد فارسی نے ان علاقوں کا سفر کیا تو وہ اپنے ساتھ مذہب حنفی کو بھی لیتے گئے اور اُس کی تخم ریزی کی۔ بعد میں جب ان ممالک کی مسندِ قضا پر اسد بن فرات ابن سنان متصرف ہوا تو اُس نے مذہبِ حنفی کا چرچا عام کر دیا۔ اہلِ صقلیہ بھی بالعموم

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۳ ص ۳۶۸   [2] نظرۃ تاریخیۃ ص ۹۔

حنفی المسلک تھے۔[1]

بصریوں میں مذہب حنفی بالکل غیر معروف تھا، مہدی عباسی نے ۱۶۴ھ میں قضائے مصر پر اسماعیل بن الیسع کوفی کو مقرر کر دیا۔ یہ اسماعیل مصر کا پہلا حنفی جج تھا۔ اور سب سے پہلے اسی کے ہاتھوں مذہب حنفی کے لیے مصر کے دروازے کھلے ہیں۔ اسماعیل الکوفی کے بعد مصر میں حنفی، شافعی اور مالکی تینوں مذہبوں کے پیروؤں میں سے جج متعین ہوتے رہے ہیں۔ جب فاطمیوں نے مصر پر اپنا استیلاء قائم کر لیا تو انہوں نے مذکورہ مذاہب کو مٹا کر اسماعیلی مذہب کو غالب کر دیا۔ اور قضاء اور گورنری کے تمام مناصب پر شیعہ اور اسماعیلی مسلک کے حامیوں کو بٹھا دیا۔[2]

نورالدین محمود بن زنگی مشہور حنفی حکمران تھا، جب شام میں اس نے حکومت سنبھالی تو وہاں حنفیت کو بھی بڑی کوشش اور اہتمام سے فروغ دیا۔[3] مصر و شام پر عثمانی حکومت کے دور میں قضا کے تمام مناصب احناف کے اندر محصور ہو گئے۔ بلکہ حنفیت عثمانی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پا گئی۔ علماء اور اہلِ فقہ کی بہت بڑی تعداد سرکاری عہدوں اور قضاء کے مناصب کے حصول کی خاطر مذہبِ حنفی کی طرف راغب ہو گئی اور اس کی ترقی و عروج کا موجب ہوئی۔

حنفی لٹریچر کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے فقہ پر اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ بلکہ ان کے آراء و اقوال ملتے ہیں جنہیں ان کے تلامذہ نے مختلف مجموعوں میں مدوّن کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے امام صاحب کے مذہب کی ترویج و ترتیب کی خدمات سرانجام دی ہیں ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے سرفہرست ابو یوسف، زفر، محمد بن حسن شیبانی ہیں۔ ان میں موخر الذکر محمد بن حسن شیبانی فقہ حنفی کی تدوین میں سب سے پیش پیش ہیں۔

فقہ حنفی کی کتابوں کو اور اس کے اصل ماخذوں کو ہم تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں:۔

۱۔ کتبِ اصول۔ اس قسم کی کتابوں کو ظاہر الروایۃ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں امام ابوحنیفہ

[1] نظرۃ تاریخیۃ ص ۱۳۔ [2] ابو حنیفہ از ابو زہرہ ۱۸۷ [3] ایضاً ص ۱۶۱۱

ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے اقوال پر مشتمل ہیں۔ ان اقوال کو امام محمد رحمہ اللہ نے چھ کتابوں کے اندر مدون کیا ہے جن کے نام یہ ہیں، المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر
۲۔ کتب النوادر۔ ان سے مراد امام محمد بن حسن کی کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، رقیات اور ابو یوسف کی امالی ہیں۔
۳۔ الفتاوی والواقعات۔ یہ ان مسائل واحکام کے مجموعے ہیں جنہیں متاخرین نے مستنبط کیا ہے۔ ان میں سے سب سے پہلا مجموعہ ابو اللیث سمرقندی کی کتاب النوازل ہے۔ قاضیخان اور رضی الدین سرخسی کی محیط بھی انہیں میں شامل ہیں۔[1]

حنفیہ عقائد میں امام ابو منصور محمد ماتریدی کے تبع ہیں۔ اشعریوں اور احناف کے مابین دس بارہ مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حنفی زیادہ تر ماتریدی ہیں، کسی حنفی کا عقائد میں اشعری ہونا شاذونادر ہی ہے۔[2]

مذہب مالکی | صاحب مذہب امام مالک بن انس اصبحی ۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں ان کی رحلت ہوئی۔ اس مذہب کے ماننے والے اہل الحدیث کہلاتے ہیں۔ احکام و مسائل میں مالکیہ نے دوسروں سے ہٹ کر ایک الگ ماخذ بھی اختیار کیا ہوا ہے اور وہ ہے عمل اہل مدینہ۔[3] اس بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ شریعت میں اہل مدینہ اور ان کے اعمال و اقوال خاص قیمت اور اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ اہل مدینہ نسلاً بعد نسلٍ اپنے اسلاف تابعین اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقش پا پر چلنے والے ہیں اور یہی چیز ان کے عمل کو ایک اہم اور مؤثر شرعی دلیل اور ماخذ کا درجہ دے دیتی ہے۔

امام مالکؒ کا مذہب حجاز، بصرہ، مصر اور بلادِ مغرب اور اندلس و سوڈان میں غالب رہا ہے۔ چوتھی صدی ہجری تک ـــ بغداد میں بھی اسے تفوق حاصل رہا ہے۔ بصرہ میں اسے پانچویں صدی کے بعد زوال ہونا شروع ہو گیا تھا۔[4]

---

[1] ابو حنیفہ از ابو زہرہ ص ۱۶۱
[2] ایضاً ص ۱۰
[3] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۲۴
[4] ایضاً ص ۴۲۵

سرزمین مصر پر سب سے پہلے مذہب مالکی کو داخل کرنے والے دو طالب علم ہیں: ایک عثمان بن حکم الجذامی (متوفی ۱۶۳ھ) اور دوسرے عبدالرحیم بن خالد بن یزید[2]۔ افریقیہ کے بارے میں جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں پہلے وہاں احادیث و آثار کا چرچا تھا پھر حنفیت کو فروغ ہوا اور جب ۴۰۷ھ میں وہاں معز بن بادیس صنہاجی والی مقرر ہوا تو اُس نے افریقیہ اور اُس کے ماتحت علاقوں کے باشندوں کو مذہب مالکی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہاں پہلے سے قائم شدہ مذہبی اختلافات کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک تمام مغرب پر مذہب مالکی کا طوطی بول رہا ہے اور اس مذہب کے ماننے والوں کو مغرب میں اکثریت حاصل ہے۔ ابن خلدون کی نظر میں مذہب مالکی کی شہرت و وسعت کے اسباب یہ ہیں:

رہے امام مالک، تو اہلِ مغرب و اندلس کے لیے ان کا مذہب مخصوص ہو چکا ہے۔ اگرچہ دوسرے علاقوں میں بھی اس کے ماننے والے ملتے ہیں۔ مغرب و اندلس کے لوگ امام مالک کے علاوہ بہت کم مسائل میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کا زیادہ تر سفر حجاز کی جانب ہوتا تھا اور وہی ان کی منزلِ مقصود ہوتا تھا۔ ان دنوں مدینہ مرکزِ علم تھا۔ یا پھر عراق میں علوم کا چرچا تھا۔ لیکن عراق اہلِ مغرب کے راستے میں نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے علمائے مدینہ سے اکتسابِ علم پر اکتفا کر لیا۔ مدینہ میں مسند امامت و مشیخت امام مالک کو حاصل تھی۔ چنانچہ وہی مغرب اور اندلس کے استاذ اور مرجع قرار پا گئے۔ اہلِ عراق میں اس وقت جو تہذیب و شائستگی نمودار ہو چکی تھی اُس سے یہ لوگ سراسر بے خبر تھے۔ بلکہ یہ اپنے بدوی مزاج کی وجہ سے اہلِ حجاز کی جانب زیادہ مائل تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر مذہب مالکی کو ان کے اندر ہمیشہ تازگی اور فروغ رہا۔ دوسرے مذاہب کے اندر بعد میں جو اصلاحات و تنقیحات واقع ہوئیں مغرب و اندلس میں مذہب مالکی ان اصلاحات و ترمیمات سے یکسر بے تعلق رہا ہے[3]۔

[1] نظرۃ تاریخیہ ص ۶۰ [2] الدیباج المذہب [3] ابن خلدون ص ۱۲

اندلس میں پہلے امام اوزاعی کے مذہب کو شہرت و مقبولیت تھی۔ دوسری صدی ہجری کے بعد اس مذہب کی بساط لپٹنا شروع ہو گئی ۔ کیونکہ امام مالک کے تلامذہ کی ایک جماعت جن میں زیاد بن عبدالرحمٰن، غازی بن قیس اور فرعوس کے نام بھی آتے ہیں، جب اندلس میں داخل ہوئی تو انہوں نے مالکی مذہب کی تبلیغ عام شروع کر دی۔ وہاں کے امیر ہشام بن عبدالرحمٰن نے بھی ان سے تعاون کیا اور لوگوں کو مالکیت کا حلقہ بگوش ہونے کے لیے اُکسایا۔ مؤرخین میں اس امر میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اندلس میں مذہب مالکی کو کس کس نے فروغ دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ کثیر اللیثی پہلے شخص ہیں جنہوں نے وہاں مالکیت کی تخم ریزی کی۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ زیاد بن عبدالرحمٰن قرطبی الملقب بہ شبطون کے ہاتھوں یہ کام سرانجام پایا[1] لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام صرف ایک ہی شخص نے نہیں کیا بلکہ مختلف مواقع پر مختلف اشخاص اسے کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے مؤرخین کا اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے۔

جس طرح عقائد میں حنفیہ ابومنصور ماتریدی کے پیرو ہیں، اسی طرح مالکیہ عقائد میں ابوالحسن اشعری کے پیرو ہیں۔ اور اس میں یہاں تک شدت برتتے ہیں کہ کوئی ایسا مالکی دنیا میں نہیں ملے گا جو اشعری نہ ہو[2]

اس مذہب کی اہم کتابیں یہ ہیں:

مؤطا۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کی اپنی تالیف ہے۔ رسالۃ مالک الی الرشید (امام مالک کا خط ہارون رشید کے نام)۔ المدونہ۔ اسے ایک افریقی عالم سحنون نے مرتب کیا ہے اور ابن زید نے المختصر کے نام سے اس کی تلخیص لکھی ہے۔ العتبیہ۔ اس کے جامع العتبی ہیں۔ الواضحہ، جسے عبدالملک بن حبیب اندلسی نے تالیف کیا ہے۔ موخرالذکر دونوں کتابیں (العتبیہ اور الواضحہ) اہل اندلس میں نہایت معتبر اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ العتبیہ پر اندلس کے علماء نے لاتعداد شروح اور تخریجات لکھی ہیں۔ ابن رشید سے بھی اس کی ایک شرح منقول ہے۔ ابن ابی زید نے مذہب

[1] نظرۃ تاریخیۃ ص ۶۶
[2] ایضاً ص ۶۷۔

مالکی کی بنیادی کتب میں جتنے مسائل و اقوال اور اختلافات وارد ہیں، ان سب کو یکجا جمع کیا ہے جو کتاب النوادر کے نام سے معروف ہے اور آخر میں عمرو بن حاجب کی کتاب جب مالکی لٹریچر میں نمودار ہوئی ہے تو اُس کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ اسے مذہب مالکی کے اندر دستور العمل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کتاب میں عمرو بن حاجب نے ہر مسئلے کے بارے میں مالکی فقہاء اور علماء کے آراء و اقوال کا ملخص بیان کیا ہے[1]۔

مذہب شافعی | یہ مذہب امام محمد بن ادریس شافعی قرشی کی طرف نسبت رکھتا ہے۔ امام شافعی کی پیدائش غزہ میں سنہ ۱۵۰ھ کو ہوئی۔ اور وفات سنہ ۲۰۴ھ میں مصر میں ہوئی۔ ان کا مذہب مذاہب اربعہ کی نسبت قدامت میں تیسرے درجہ پر ہے۔ شوافع کو بھی مالکیہ کی طرح اہل الحدیث کہا جاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی زندگی میں جو اصل کارنامہ سر انجام دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے فقیہانہ استنباط کے اصول و قواعد مرتب کرنے، انہیں ایک عظیم علم کی صورت میں پیش کرنے اور فقہ کو اس علم کے قواعد و کلیات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے غیر معمولی سعی و جہد دکھائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب شافعی اہل عراق اور اہل حجاز کے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ارسطو کو علم منطق کا واضع اور خلیل بن احمد کو علم عروض کا موجد ہونے کا مرتبہ حاصل ہے اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کو علم اصولِ فقہ کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے[2]۔

اس مذہب کی نشو و نما مصر میں ہوئی، اور وہاں بہت بڑی تعداد اس کی حلقہ بگوش ہوئی، پھر عراق کی جانب اس کا پھیلاؤ شروع ہوا۔ بغداد اور خراسان، شام اور یمن کے اکثر علاقوں میں اس کا سکہ جمتا چلا گیا۔ ماوراء النہر، فارس، حجاز اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی اس کے کافی اثرات پہنچے۔ افریقہ اور اندلس میں سنہ ۳۰۰ھ کے بعد اس کے بعض اقوال و افکار سے وہاں کے لوگ شناسا ہوئے[3]۔

مصر میں شافعیت سے پہلے حنفیت اور مالکیت کا سکہ رواں تھا۔ جب امام شافعی رحمہ اللہ مصر تشریف لے گئے اور وہاں قیام اختیار کر لیا تو ان کا مذہب فقہی حلقوں میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔ ابن

---

[1] مقدمہ ابن خلدون [2] الشافعی مصنفہ مصطفیٰ عبد الرزاق ص ۶۴ [3] نظرۃ تاریخیۃ ص ۲۸-۲۹

خلدون نے لکھا ہے:

"امام شافعی رحمہ اللہ کے مقلدین اور متبعین کی زیادہ تر تعداد مصر میں ہے۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے ممالک میں بھی شافعیت کو کافی شہرت نصیب ہوئی ہے ان علاقوں میں پہلے حنفیت کی حکمرانی تھی جب شافعیت وہاں پہنچی تو ان لوگوں نے افتاد اور درس و تدریس کے اندر ہر شہر میں احناف کے ساتھ مسابقت شروع کر دی۔ جگہ جگہ حنفیوں اور شافعیوں کے مابین مناظرات و مباحثات کی محفلیں برپا ہونا شروع ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں خلافیات کے موضوع پر کتابوں کا عجیب و غریب ذخیرہ وجود میں آ گیا جن کے صفحات گوناگوں براہین اور بوقلموں استدلالات سے بھرے ہوئے تھے۔ جب مشرق پر انحطاط و زوال اور شکست و ریخت کی آندھی چلی تو اس کے تند و تیز تھپیڑوں میں یہ ذخیرہ بھی نیست و نابود ہو گیا۔ امام شافعی جب مصر میں خاندان بنی عبدالحکم کے پاس جا کر اترے تو اس خاندان میں سے ایک جماعت نے امام موصوف کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کے ساتھ اشہب، ابن القاسم، ابن المواز اور حرث بن مسکین اور اس کی اولاد نے بھی اسی مسلک کو مشعلِ راہ بنا لیا۔ اور اس کو فروغ دینے میں لگ گئے۔ جب مصر پر رافض کو غلبہ حاصل ہو گیا تو مصر کی سرزمین اہلِ سنت کی فقہ کے لیے تنگ ہو گئی اور اس کی جگہ اہلِ بیت کی فقہ متداول ہو گئی خاندان عبیدیہ تک یہی صورت حال رہی۔ جب صلاح الدین یوسف بن ایوب کے ہاتھوں خاندان عبیدیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ صورتِ حال بھی یکلخت بدل گئی۔ عراق و شام کی طرف سے شافعی علماء کی بہت بڑی تعداد مصر میں آنا شروع ہو گئی اور فقہ شافعی کو دوبارہ مصر میں عروج حاصل ہو گیا جو پہلے سے کہیں زیادہ دیرپا اور اثرات کے لحاظ سے گہرا ثابت ہوا۔"[1]

مذہب شافعی کی شہرت و ترقی میں فقہی مدارس کی تحریک نے بھی مدد بہم پہنچائی ہے۔ ان مدارس میں صرف شافعی مسلک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خاص طور پر عراق و فارس میں نظام الملک کے مدارس اور

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۴ - ۴۲۶ -

مصر و شام میں ایوبی حکمرانوں کے مدارس نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاندان ایوبی کے تمام حکمران حلقہ بگوشِ شافعیت تھے۔ ان میں صرف ملک معظم عیسیٰ بن عادل والی شام ایسا تھا جو مسلکِ حنفی کا پیرو تھا۔ ورنہ یہ پورے کا پورا خاندان شافعی تھا اور ان کی اولاد بھی آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتی رہی[۵]۔

شافعیہ کی غالب اکثریت اصول و عقائد میں ابوالحسن اشعری کی پیرو اور اس معاملے میں مالکیہ کی ہم مشرب ہے۔

مسلک شافعی کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ الرسالہ۔ یہ کتاب فقہ کے اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ اُس کے مؤلف خود امام موصوف ہیں۔

۲۔ کتاب الام۔ یہ کتاب بھی امام شافعی کی اپنی تصنیف ہے۔ اگرچہ حال ہی میں مصر کے ڈاکٹر زکی مبارک نے ایک مضمون میں یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب امام شافعی کے شاگرد بویطی کی تالیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق محلِ نظر ہے۔

۳۔ کتاب اختلاف الحدیث۔ یہ کتاب امام صاحب نے سنت کی حمایت میں رقم فرمائی تھی۔

۴۔ المسند۔ اس کتاب میں کتاب الام میں وارد ہونے والی احادیث کی تخریج ہے۔

امام صاحب کے شاگرد بویطی نے بھی المختصر الکبیر، المختصر الصغیر اور کتاب الفرائض کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔

مذہبِ حنبلی امام احمد بن حنبل شیبانی رحمہ اللہ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور بغداد ہی میں ۲۴۱ھ میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ آپ کی پیدائش مرو نامی مقام میں ہوئی ہے۔ اور آپ ابھی دودھ پیتے بچے تھے کہ آپ کو بغداد لے جایا گیا۔ آپ خالص عربی ہیں اور والد اور والدہ دونوں کی جانب سے شیبانی ہیں۔ آپ کے والد عہدِ عباسی میں سالارِ لشکر تھے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی تعلیم کا آغاز امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابو یوسف سے کیا۔ بعد میں حلقۂ محدثین سے وابستہ ہو گئے۔ آپ درس و تدریس کی مسند پر چالیس برس کے بعد فروکش ہوئے۔

استنباطِ احکام و استخراجِ مسائل میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے اُسے ابن القیم نے اعلام الموقعین

---

[۱] ابن خلکان ج ۱ ص ۵

[۲] نظرۃ تاریخیۃ از احمد تیمور ص ۳۷۔

میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"امام احمد بن حنبل کے فتاویٰ پانچ اصولوں پر مبنی ہوتے تھے :۔

۱۔ نصوص، کسی مسئلے کے بارے میں اگر آپ کو کتاب و سنت سے نص دستیاب ہو جاتی تو آپ بلا تامل اُسے اپنے فتویٰ کا ماخذ بنا لیتے، اور اس کے بعد آپ یہ پروا نہ کرتے کہ کوئی دوسرا قول اس کے برعکس واقع ہو رہا ہے یا کسی دوسرے شخص کی طرف سے، خواہ کوئی بھی ہو، اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔

۲۔ فتویٰ صحابی، اگر آپ کو کسی صحابی کا ایسا فتویٰ مل جاتا جس میں کوئی دوسرا صحابی اس کی مخالفت نہ کر رہا ہو، تو آپ اُسے اختیار فرما لیتے۔ اور آپ شدتِ ورع و حزم کی وجہ سے یہ نہ فرماتے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے بلکہ اتنا کہتے کہ "اس کی مخالفت میں کوئی رائے میرے علم میں نہیں آئی"۔

۳۔ صحابہ میں اختلاف برپا ہو جانے کے موقع پر آپ وہ قول اختیار فرماتے جسے آپ کتاب و سنت سے زیادہ قریب پاتے یعنی آپ صحابہ کے اقوال سے کسی حالت میں بھی باہر نہ نکلتے بلکہ انہی میں سے کسی ایک کو اقرب الی الکتاب والسنتہ سمجھ کر قبول کر لیتے۔ اگر آپ کو مختلف اقوال میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان نہ ہوتا تو آپ اپنی طرف سے کسی قول کو قطعی طور پر اختیار کر لینے کا فیصلہ دینے کے بجائے صرف اتنا کہہ دیتے کہ "اس معاملہ میں صحابہ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے"۔

۴۔ آپ مرسل اور ضعیف حدیث کو بھی اس شرط کے ساتھ درجۂ قبولیت میں رکھ لیتے کہ کوئی دوسری حدیث اس کے خلاف واقع نہ ہو۔ امام احمد بن حنبل وہ واحد فقیہ ہیں جنہوں نے مرسل اور ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دی ہے۔ ضعیف حدیث سے مراد ان کے نزدیک باطل اور منکر احادیث نہیں ہیں اور نہ وہ روایات ہی ہیں جنہیں اختیار کرنے اور معمول بہ بنانے کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث، صحیح حدیث

کے مد مقابل ہے۔ اور حسن کی اقسام میں شامل ہے۔ امام احمد احادیث کی تقسیم صحیح حسن اور ضعیف کے درجوں میں نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں صرف دو قسمیں تھیں ایک صحیح اور دوسری ضعیف۔ اور ضعیف کے بھی انہوں نے کئی مدارج متعین کر رکھے تھے۔ اس لحاظ سے جو حدیث ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتی تھی وہ ضعیف ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر غیر صحیح حدیث واجب الاسترداد ہو۔

۵۔ قیاس، اس ماخذ کو بھی انہوں نے حسب ضرورت اختیار کیا ہے، لیکن ان کے مسلک میں اس کی بہت کم نوبت آئی ہے" (اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۰-۱۱)

مذہب حنبلی کے نخل کی تخم ریزی سب سے پہلے عراق میں ہوئی۔ اور پوری صدی تک عراق کی حدود کے اندر برگ و بار لایا۔ کیونکہ امام احمد بن حنبل کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے اور عراق سے باہر مذہب حنبلی کے اثرات چوتھی صدی ہجری میں پہنچے ہیں مصر و شام میں اس کا داخلہ اس وقت ہوا جب وہاں سے فاطمی اقتدار رخصت ہوا۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا اصل مرکز بغداد تھا جہاں شیعیت کے ساتھ اس کی مسابقت تھی۔ یہ بات مجموعی طور پر اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ مذہب حنبلی کے ماننے والوں کی تعداد ہر دور میں بہت کم رہی ہے۔ ایک حنبلی عالم نے ذیل کے اشعار میں اسی ولدوز حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے[1]:

یقولون لی قد قل مذهب احمد　　　　وکل قلیل فی الانام ضئیل

(مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں امام احمد کا مذہب بہت کم پایا جاتا ہے، اور جو چیز بھی قلت میں ہو اس کی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

فقلت لهم مهلا غلطتم بزعمکم　　　　الم تعلموا ان الکرام قلیل

(ایسے معترضین کو میرا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ خیال سراسر باطل ہے کیا نہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں شرفا کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے۔

[1] نظرة تاریخیة ص ۳۸-۴۰

اس مذہب کو دورِ حاضر میں اگر کہیں غلبہ و تفوق حاصل ہے، تو وہ نجد میں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نجد میں وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی المسلک تھے اور جب انھوں نے تجدید و اصلاح کی تحریک اٹھائی اور نجد کے علاقے پر غلبہ حاصل کیا تو مذہب حنبلی کو بھی اس سے فروغ اور اقتدار نصیب ہوا۔

ابن عقیل مسلکِ حنبلی کے معروف عالم گذرے ہیں، بروایت ابن جوزی انہوں نے اس مذہب کی عدمِ مقبولیت کے وجوہ میں یہ لکھا ہے کہ اس مذہب کے پیرووں میں ورع و زہد کی شدّت کا یہ عالم رہا ہے کہ وہ سرکاری عہدوں سے ہمیشہ دُور بھاگتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے امام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی موقع پر بھی قضا یا ولایت کے مناصب قبول نہیں کیے۔ ابن عقیل کے الفاظ یہ ہیں:

> ”اس مذہب پر سب سے بڑا ظلم خود اس کے ماننے والوں نے کیا ہے۔ ابوحنیفہ اور شافعی کے متبعین میں سے جب بھی کوئی علم و فن میں دستگاہ حاصل کر لیتا قضا یا ولایت یا کسی بڑے عہدے پر لگ جاتا اور یہ اقتدار اسکے مسلک کی درس و تدریس اور توسیع کے معاملے میں مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا، اس کے برعکس امام احمد کے اصحاب کا یہ حال رہا ہے کہ ان میں سے جونہی کسی نے کچھ نہ کچھ علم سے وابستگی پیدا کی، یہ علم اُسے دنیا بیزاری، زہد و ورع اور تعبد و تحنث کی طرف لے گیا۔ ان لوگوں پر جذباتِ لطیفہ کا بالعموم غلبہ رہتا تھا اور اسی بنا پر تعلیم و تدریس کے مشاغل سے بھی بسا اوقات پہلو کش رہتے تھے[1]۔“

ابن عقیل نے جن عوامل کی نشاندہی کی ہے ہم اس پر مزید دو عوامل کا اضافہ کرتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک مذہب حنبلی کی عدم اشاعت اور نامقبولیت میں ان دو عوامل کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان میں پہلا عامل یہ ہے کہ یہ مذہب حنفیت، مالکیت اور شافعیت کے بعد چوتھے نمبر پر ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت ملت کی اکثریت مذکورہ تینوں مذہبوں میں سے کسی نہ کسی سے اپنا دامن باندھ چکی تھی اور بہت قلیل تعداد میں ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو ان کے اثرات سے متاثر ہوئے تھے۔

---

[1] مناقب امام احمد از ابن جوزی ص ۲۴۰

دوسرا اہم عامل یہ ہے کہ حنابلہ نے جس دور میں اسلامی سوسائٹی کے اندر مذہبی و اخلاقی اصلاح کا بیڑا اٹھایا وہ عباسی اقتدار کا دورِ زوال تھا۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ حنابلہ مصلحین عوام کو خیر خواہانہ جذبات تعلیم و تربیت اور نصیحت و ارشاد کے ذریعے راہِ راست پر لانے کے بجائے تشدّد اور سخت گیری سے پیش آتے تھے چنانچہ ان کی اس روش سے عام طور پر لوگوں میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ کامل ابن اثیر میں ۳۲۳ھ کے وقائع کے تحت یہ بیان ملتا ہے کہ اس سن میں حنابلہ کا نفوذ بڑھ گیا اور ان کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے فوجی سالاروں، بڑے بڑے لوگوں اور عامۃ الناس کے گھروں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ جہاں کہیں نبیذ (شراب کی ایک قسم) پاتے، اُسے گرا دیتے، کسی رقاصہ یا مغنّیہ کو دیکھتے تو اُسے زدوکوب کرتے اور آلاتِ موسیقی کو توڑ پھوڑ دیتے۔ منڈیوں اور بازاروں میں گھس کر لوگوں پر نکتہ چینیاں کرتے، راستوں میں مردوں کو عورتوں اور بچوں کے اختلاط سے روکتے۔ ان کی سخت گیریوں اور تشدد آمیز کارروائیوں سے لوگ بلبلا اُٹھے اور ہر طرف شکوہ و شکایات کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ خلیفہ کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اُس نے ایک نہایت سخت فرمان جاری کیا جس میں حنابلہ کو یہ روش اختیار کرنے پر عبرت ناک سزاؤں کی دھمکی دی۔ اس فرمان کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

"امیر المومنین برملا خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے۔ اور اس قسم کو وہ پورا کر کے چھوڑے گا۔ کہ اگر تم اپنے اس مذموم مذہب اور غلط طریقے سے باز نہ آئے تو وہ تمہارا زن بچہ کو لہو میں بلوا دیگا۔ تمہاری گردنوں کو تلوار سے ناپے گا اور تمہارے گھروں کو اور ٹھکانوں کو نذرِ آتش کر دیگا۔"

فقہ حنبلی کے مآخذ میں سب سے زیادہ اہمیت ذیل کی کتابوں کو حاصل ہے:

المسند، یہ حدیث پر نہایت وسیع اور جامع کتاب ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے جمع کیا ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیّم کی تصنیفات کو بھی حنبلی لٹریچر میں شمار کیا جاتا ہے، خاص طور پر ابن قیّم کی "اعلام الموقعین" اور "القیاس فی الشرع الاسلامی" کو اس مذہب کے مصادرِ اصلیہ میں محسوب کیا گیا ہے۔